رسائل و مسائل

زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک

[جناب خان محمد صاحب ربانی (ملتان) کا ایک مضمون "علماء کرام سے چند سوالات" کے زیر عنوان محرم ۱۳۷۴ھ کے "ترجمان" میں (تیز تسنیم میں) شائع ہوا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ابھی تک ان سوالات کا کسی جانب سے جواب نہیں دیا گیا۔ جیل کے ذمہ داران کی وساطت سے یہ سوالات مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تک پہنچا کر اُن سے بھی اس بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔ مولانا محترم نے ان سوالات سے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی ہے، جو سنسر ہونے کے بعد جیل سے باہر آئی ہے۔ ہم اسے بھی "ترجمان" میں شائع کر رہے ہیں تاکہ "مسئلہ تملیک" کے سارے پہلو سامنے آجائیں اور جو صاحب علم بھی ربانی صاحب کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب دینا چاہیں وہ جواب دیتے وقت ان تنقیحات کو بھی پیش نظر رکھیں جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کی ہیں۔]

زکوٰۃ کے متعلق جناب خان محمد صاحب ربانی کے سوالات میرے علم میں لائے گئے ہیں اور مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ اس معاملے میں میری تحقیق کیا ہے۔ مختصراً میں اپنی رائے عرض کرتا ہوں۔

جس فتوے پر یہ سوالات کیے گئے ہیں، میرے نزدیک وہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ... الخ کی اُس تاویل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے جو حنفیہ نے اختیار فرمائی ہے۔ اس مطلب کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ	صدقات تو فقراء کے لیے ہیں اور مساکین کے لیے
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ	اور اُن لوگوں کے لیے جو اُن پر کام کرنے والے ہوں

مُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمۡ ..... الخ — اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مقصود ہو ... الخ

دیکھیے یہاں لام کا عمل صرف فقراء ہی پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ مساکین، عاملین علیہا اور مولفۃ قلوبہم پر بھی ہو رہا ہے۔ یہ لام تملیک کے لیے ہے تو، اور استحقاق یا اختصاص یا کسی اور معنی کے لیے ہے تو، بہرصورت جس معنی میں بھی وہ فقراء سے متعلق ہو گا اُسی معنی میں باقی تینوں سے بھی متعلق ہو گا۔ اب اگر حنفی تاویل کے لحاظ سے وہ تملیک کا مقتضی ہے تو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کا مال ان چاروں میں سے جس کے حوالے بھی کر دیا جائے گا تملیک کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ آگے تملیک در تملیک کا حکم کہاں سے نکالا جاتا ہے؟ کیا فقیر یا مسکین کی ملک میں زکوٰۃ کا مال پہنچ جانے کے بعد اس کے تصرفات پر کوئی پابندی ہے؟ اگر نہیں تو عاملین علیہا کے ہاتھ میں مال پہنچ جانے کے بعد، جبکہ لامِ تملیک کا تقاضا پورا ہو چکا، پھر مزید تملیک کی پابندی لگانے کے لیے کیا دلیل ہے؟

لام کو اگر تملیک ہی کے معنی میں لیا جائے تو ایک شخص جب زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کے اموال عاملین علیہا کے سپرد کر دیتا ہے تو گویا وہ اُنہیں اُس کا مالک بنا دیتا ہے، اور یہ اُسی طرح اُن کی ملک بن جاتے ہیں جس طرح فئے اور غنیمت کے اموال حکومت کی ملک بنتے ہیں، پھر اُن پر یہ لازم نہیں رہتا کہ وہ اُن اموال کو آگے جن مستحقین پر بھی صرف کریں بصورتِ تملیک ہی کریں۔ بلکہ اُنہیں یہ حق حاصل ہے کہ باقی ماندہ سات مصارفِ زکوٰۃ میں اس کو جس طرح مناسب اور ضروری سمجھیں صرف کریں۔ لامِ تملیک کے رو سے اُن پر کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ جو قید لگائی جا سکتی ہے وہ صرف یہ کہ جو شخص بھی زکوٰۃ کی تحصیل و صرف کے سلسلے میں کوئی عمل کرے وہ بس اس عمل کی اُجرت لے لے۔ باقی مال اُسے دوسرے مستحقینِ زکوٰۃ پر صرف کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ یہ لوگ عاملین علیہا ہونے کی حیثیت سے ان اموال کے مالک بنائے جاتے ہیں نہ کہ بجائے خود مستحق ہونے کی حیثیت سے۔ "عاملین علیہا" کا لفظ خود اُس وجہ کو ظاہر کر دیتا ہے جس کے لیے زکوٰۃ اُن کے حوالے کی جاتی ہے، اور یہی لفظ یہ بھی طے کر دیتا ہے کہ وہ عامل ہونے کی حیثیت سے اس مال کا کتنا حصّہ جائز طور پر اپنے ذاتی تصرف میں لانے کا حق رکھتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد اُس حدیث پر نگاہ ڈالیے جو امام احمد نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کی ہے۔ اس میں حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اذا ادیتُ الزکوٰۃَ الی رسولک فقد برئتُ منھا الی اللہ و رسولہ "جب میں نے آپ کے بھیجے ہوئے عامل کو زکوٰۃ ادا کر دی تو میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنے فرض سے بری الذمہ ہو گیا نا؟" حضورؐ نے جواب دیا "نعم، اذا ادیتَھا الی رسولی فقد برئتَ منھا الی اللہ و رسولہٖ فلک اجرھا و اثمھا علی من بدلھا" "ہاں! جب تُو نے اسے میرے فرستادہ عامل کے حوالہ کر دیا تو تُو اللہ اور اس کے رسول کے آگے اپنے فرض سے بری الذمہ ہو گیا۔ اس کا اجر تیرے لیے ہے اور جو اس میں ناجائز تصرف کرے اس کا گناہ اسی پر ہے۔" اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اپنی زکوٰۃ عاملین علیہا کے سپرد کر کے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر لامِ تملیک کا تقاضا جس طرح کسی فقیر یا مسکین کو زکوٰۃ دینے سے پورا ہوتا ہے اسی طرح عاملین علیہا کو دے دینے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اب یہ فتویٰ کس بنیاد پر دیا جاتا ہے کہ عاملین علیہا اگر آگے تملیک ہی کے طریقے پر اموالِ زکوٰۃ کو صرف کرتے ہوں تو انہیں زکوٰۃ دو ورنہ نہیں؟ زکوٰۃ دینے والوں پر یہ دیکھنا کس نے فرض کیا ہے کہ عاملین کس طریقے پر عمل کرتے ہیں؟ اُن کا فرض صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مستحقین کو، یا اُن کے لیے کام کرنے والے عاملین کو اپنے اموالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دیں۔ عاملین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جس شخص کو اس حیثیت سے زکوٰۃ دی جا رہی ہو اس کے بارے میں زکوٰۃ دینے والا یہ اطمینان کر لے کہ وہ واقعی "عامل" ہے یا نہیں۔ حکومت اسلامی موجود ہو، اور اس نے عاملینِ زکوٰۃ مقرر کیے ہوں تو اُن کے پاس حکومت کی طرف سے تحصیلِ زکوٰۃ کا پروانہ موجود ہونا ہی اس اطمینان کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو اور مسلمانوں کی کسی اجتماعی تنظیم نے بطورِ خود زکوٰۃ کی تحصیل و صرف کا بندوبست کیا ہو تو اس کے بارے میں بس یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ وہ واقعی مستحقینِ زکوٰۃ پر اس مال کو صرف کرتی ہے۔ اور "عمل" کے مصارف اسی حد تک لیتی ہے جنہیں جائز و معقول کہا جا سکے۔ تحقیق سے ان باتوں کا اطمینان ہو جائے

تو اس کو زکوٰۃ دینے والا یقیناً فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ کوئی شرعی دلیل مجھے ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر زکوٰۃ دینے والوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ عاملین علیہا کو زکوٰۃ دینے سے پہلے یہ بھی تحقیق کریں کہ وہ اموالِ زکوٰۃ کو بطریقِ تملیک صرف کرتے ہیں یا نہیں۔

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ "عاملین علیہا" کے الفاظ جو قرآن میں ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اُن کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے۔ لوگ اسے صرف اُن کارندوں تک محدود سمجھتے ہیں جن کو حکومتِ اسلامی اس کام کے لیے مقرر کرے۔ لیکن قرآن کے الفاظ عام ہیں جن کا اطلاق ہر اُس شخص پر ہو سکتا ہے جو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے سلسلے میں "عمل" کرے۔ اس عام کو خاص کرنے والی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر حکومتِ اسلامی موجود نہ ہو، یا ہو مگر اس فرض سے غافل ہو، اور مسلمانوں میں کوئی گروہ یہ "عمل" کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو، تو آخر کس دلیل سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہیں تم "عاملین علیہا" نہیں ہو۔ میرے نزدیک تو یہ اللہ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے کہ اُس نے عاملینِ حکومت کے لیے خاص کرنے کے بجائے اپنا حکم ایسے عام الفاظ میں دیا ہے جن میں یہ گنجائش پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر موجودگی یا غافل حکمرانوں کی موجودگی میں مسلمان بطورِ خود بھی زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لیے مختلف انتظامات کر سکیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے اس عام حکم کو عام ہی رہنے دیا جائے تو غریب طلبا کی تعلیم، یتیموں کی پرورش، بوڑھوں اور معذوروں اور اپاہجوں کی نگہداشت، نادار مریضوں کے علاج، اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے لیے جو ادارے قائم ہوں، اُن سب کے منتظمین بالکل بجا طور پر "عاملین علیہا" کی تعریف میں آئیں گے، اور اُن کو زکوٰۃ لینے اور حسبِ ضرورت صرف کرنے کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے، اور اُن حیلہ بازیوں کی کوئی حاجت باقی نہ رہے گی جو آج کل ہمارے عربی مدرسوں کے مہتمم حضرات زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اس طرح ایسے ادارات قائم کرنے کی بھی گنجائش نکل آئے گی جو خاص طور پر تحصیل و صرفِ زکوٰۃ ہی کے لیے قائم ہوں۔ اُن کے منتظمین بھی "عاملین علیہا" قرار پائیں گے۔ اور صرفِ زکوٰۃ کے معاملے میں اُن کے ہاتھ بھی تملیک کے فتوے سے باندھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

میرے نزدیک اگر قرآن کے الفاظ کی عمومیت نگاہ میں رکھی جائے۔ تو صرف مذکورۂ بالا عاطین ہی

پر اُن کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ دوسرے بہت سے کارکن بھی اس تعریف میں آتے ہیں، مثلاً:

ایک یتیم کا ولی، ایک بیمار یا اپاہج کی خبر گیری کرنے والا، اور ایک بیکس بوڑھے کا نگہبان بھی "عامل" ہے، اسے زکوٰۃ وصول کر کے ان لوگوں کی ضروریات پر خرچ کرنے کا حق ہے، اور اس میں سے معروف طریقے پر اپنے عمل کی اُجرت بھی وہ چاہے تو لے سکتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں ڈاک خانے یا تار کو اُجرت دی جا سکتی ہے، کیونکہ اس خدمت کو انجام دینے کی خاطر وہ بھی "عاملین علیہا" ہونگے۔

زکوٰۃ وصول کرنے، یا زکوٰۃ کے اموال ایک جگہ سے دوسری جگہ حسب ضرورت لے جانے، یا مستحقین زکوٰۃ کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے ریل، بس، ٹرک، ٹانگے، ٹھیلے وغیرہ جو استعمال کیے جائیں اُن کے کرائے مالِ زکوٰۃ سے دیئے جا سکتے ہیں، کیونکہ یہ خدمات انجام دیتے وقت یہ سب "عاملین علیہا" میں ہی شمار ہونگے۔

مستحقین زکوٰۃ کی خدمت کے لیے جس قدر بھی ملازم اور مزدور استعمال کیے جائیں گے ان سب کی تنخواہیں اور اُجرتیں زکوٰۃ کی مد سے دی جا سکتی ہیں، کیونکہ وہ سب عاملین علیہا میں داخل ہیں قطع نظر اس سے کہ کوئی ریلوے سٹیشن پر زکوٰۃ کے غلے کی بوریاں ڈھوئے، یا کوئی غریب مریضوں کی خدمت کے لیے گاڑی چلائے، یا کوئی یتیم بچوں کی نگہداشت کرے۔

اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا عاملین علیہا کے تصرفات پر کوئی ایسی پابندی ہے کہ وہ مستحقین زکوٰۃ کی خدمت کے لیے عمارات نہ بنوا سکیں اور اشیائے ضرورت، مثلاً گاڑیاں، دوائیں، آلات، کپڑے وغیرہ نہ خرید سکیں؟ میں کہتا ہوں کہ حنفی تاویل آیت کے لحاظ سے یہ پابندی صرف زکوٰۃ ادا کرنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ وہ خود بلاشبہ ان تصرفات میں سے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی رُو سے زکوٰۃ "ان کے لیے" ہے اُن کی یا اُن میں سے کسی کی ملک میں دے دیں۔ رہے "عاملین علیہا" تو ان پر اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی وہ تمام مستحقین زکوٰۃ کے لیے بمنزلہ ولی یا وکیل ہیں۔ اور اصل مستحق اس مال میں جتنے

تصرفات کر سکتا ہے وہ سب تصرفات اس کے وکیل یا وکیل ہونے کی حیثیت سے یہ بھی کر سکتے ہیں وہ جب فقراء و مساکین کی ضروریات کے لیے کوئی عمارت بنائیں یا کوئی گاڑی خریدیں، تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بہت سے فقیروں اور مسکینوں نے، جن کو فرداً فرداً زکوٰۃ ملی تھی، باہم مل کر ایک عمارت بنوالی، یا ایک سواری خرید لی۔ جس طرح اُن کے اس تصرف پر کوئی پابندی نہیں ہے اس طرح اُن کے وکیل یا ولی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ عاملین علیہا کو زکوٰۃ دینے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے مقرر کیا ہے، اور اللہ کے رسول نے اسی لیے اُن کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے والے کو فرض سے سبکدوش قرار دیا ہے کہ انہیں یہ مال دے دینا گویا تمام مستحقین کو دے دینا ہے۔ وہ انہی کی طرف سے اُسے وصول کرتے ہیں اور انہی کے نائب و سرپرست بن کر اُسے صرف کرتے ہیں۔ آپ اُن کے تصرفات پر اس حیثیت سے ضرور اعتراض کر سکتے ہیں کہ تم نے فلاں خرچ بلا ضرورت کیا، یا فلاں چیز پر ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا، یا اپنے عمل کی اُجرت معقول حد سے زیادہ لے لی، یا کسی عامل کو معقول شرح سے زیادہ اُجرت دے دی۔ لیکن کوئی قاعدۂ شرعی میرے علم میں ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر اُن کو اس بات کا پابند کیا جا سکے کہ فلاں فلاں قسم کے تصرفات تم کر سکتے ہو اور فلاں قسم کے نہیں کر سکتے۔ قواعد شریعت انہیں ہر اُس کام کی اجازت دیتے ہیں جس کی مستحقین زکوٰۃ کے لیے ضرورت ہو۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل حل طلب سوالات صرف دو ہیں:

ایک یہ کہ اگر زکوٰۃ دینے والوں اور زکوٰۃ کا استحقاق رکھنے والوں کی رضامندی سے چند غیر سرکاری آدمی زکوٰۃ پر کام کریں تو آیا وہ قرآن کے ارشاد کے مطابق عاملین علیہا کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں؟

دوسرے یہ کہ عاملین علیہا کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے کے بعد ان کے تصرفات پر ہر طرح تملیک کی قید عائد کرنے کے لیے کیا دلیل ہے؟

علماء کرام کو انہی دو سوالات پر غور کر کے کوئی فیصلہ دینا چاہیے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی)

درود کی حقیقت

سوال۔ گزشتہ اگست میں رسالہ ترجمان القرآن کے مطالعہ کا شوق چرایا۔ وجہ تحرک یہ ہوئی کہ میں دو تین سال سے طلوع اسلام کے مسلک کا ہمنوا تھا۔ وہاں کچھ ایسے راز سربستہ پائے گئے جن کے انکشاف دینی نظریے کے لیے ازبس تھے۔ میں چاہتا تھا کہ یک طرفہ بیانات پر کسی بھی نظریے کو منسلک نہ کروں ۔ الا یہ کہ فریق ثانی کے دلائل نہ سنے جائیں۔ رسالہ باقاعدہ آتا رہا اور میں اس کے مطالعہ سے ایک گونہ تسکین پاتا رہا۔ ہاں، ہاں! آپ "درود" پر میری تشفی فرمائیں کہ "اللہ اور اس کے ملائکہ رسول مدنی پر درود بھیجتے ہیں، مسلمانو! تم بھی رسول اللہ پر درود بھیجو!" تو اس کا عملی پہلو بہر حال کیا مراد ہوتا ہے؟ خدا کے درود بھیجنے سے کیا، اور امت کے درود بھیجنے میں کیا کیا فرق ہیں اور درود ہے کیا چیز! یہ کوئی الفاظ کی گردان ہے یا یہ کہ عقیدت ہے، یا کوئی اور مادی یا روحانی شے ہے؟ دینی لحاظ سے میری تشفی کی جائے۔"

جواب :۔ اہم سے اہم چیز کا جب "مذاق" اڑایا جانے لگتا ہے تو سب سے پہلے اس کا ذہنی وقار مجروح ہوتا ہے اور اسے اختیار کرنے والا آدمی احساس کہتری کی زد پر آجاتا ہے۔ اس کے بعد اسے اس چیز کی مقبولیت میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مناظرہ باز اور فتنہ پسند حضرات کبھی اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ وہ سائنٹفک اور علمی طریق پر کسی نظریے یا تصور کے بارے میں سنجیدہ بحث کریں، وہ بازاری انداز سے تضحیک و استہزاء کا پورا پورا حملہ کرتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ دلائل لڑاتے ہیں۔ یہی روش امور دینیہ کے بارے میں نیاز فتح پوری صاحب کی تھی اور یہی اب نئے پاکستانی "نیازوں" کی ہے۔ یہ دینی حقائق اور قرآنی معارف بیان کرنے سے پہلے ستر مرتبہ قدیم و جدید علمائے حق کو "ملا" اور "ماڈرن ملا" کی گالی دیں گے، پھر جس مسئلے کو چھیڑیں گے اس پر "ملائی سازش" اور

"عجمی فتنے" کی پھبتیاں کسیں گے، اور اس طرح کے پے در پے حملوں سے مخاطب کے ذہن کو پریشان کرتے ہوئے دلیل بازی فرمائیں گے۔ ٹھیک اسی طرح درود پر بھی "الفاظ کی گردان" جیسے بازاری فقرے چست کر کے جب ایک مرتبہ اس شعارِ دینی کے وقار کو زخمی کر چکیں گے تو اوپر سے دلائل کے ذریعے نمک چھڑکیں گے۔

آپ اسی "الفاظ کی گردان" کی پھبتی کو لیجیے! اسے جس طرح درود کے کلمات پر چسپت کیا جا سکتا ہے اسی طرح کلمہ طیبہ پر، اذان کے جملوں پر، نماز کے تمام الفاظ پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ اور قرآن کی دوسری سورتوں پر بھی کیا جا سکتا ہے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر کیا ان میں سے ہر چیز کی اہمیت اور قدر و قیمت ختم ہو جائے گی۔

کلمہ طیبہ ہو، نماز ہو، اذان ہو، قرأت ہو، دوسرے اذکار ہوں یا درود و صلوات ہو، اُن کو شریعت نے ہمارے معمول میں اس لیے داخل کیا ہے کہ جس طرح خیالات، جذبات اور احساسات پیدا ہو کر الفاظ میں ڈھلتے ہیں، اسی طرح جب کچھ متعین الفاظ کہے جاتے ہیں (بشرطیکہ وہ معنی کو جان کر اور غور و فکر کرتے ہوئے کہے جائیں، اور یہی ہے مطلوبِ شریعت) تو ان کو کہتے ہوئے وہ خیالات، جذبات اور احساسات ابھرتے ہیں جن کی ترجمانی ان الفاظ کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ مثلاً جیسے "تاج محل" کا تصور ذہن میں آتے ہی یہ لفظ بھی ابھر آتا ہے، اسی طرح جب ہم یہ لفظ بولتے ہیں یا کسی سے سنتے ہیں تو اس صورت میں تاج محل کا تصور بھی از خود نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ وہی نفسیاتی حقیقت ہے جس سے انسانیت نے ہمیشہ — چاہے کوئی بھی نظام ہو — کام لیا ہے۔ مثلاً بادشاہوں اور حکمرانوں اور مختلف عہدہ داروں کے لیے خاص موقع کلماتِ خطاب کا استعمال، قوم اور ملک کی عظمت کو نمایاں کرنے والے خاص الفاظ بولنا یا لکھ کے آویزاں کرنا، قومی ترانے کا گایا جانا، حلف وفاداری کے متعین الفاظ زبان سے ادا کرنا اور کرانا، وغیرہ۔ اسلامی نظامِ حیات میں اسی نفسیاتی حقیقت کی بنا پر "ذکر" کی مختلف واجب اور مستحب اقسام استوار ہیں۔ ہم جب نمازوں، اذانوں اور دعاؤں میں خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات، اس کے دین کے اصولوں، اس کے نبیؐ کے مرتبے، آخرت کی فلاح، قرآن کی آیات وغیرہ کو بیان کرتے ہیں تو یہ اس لیے کرتے ہیں کہ بولے جانے والے الفاظ کی معنوی حقیقت ذہن میں ساتھ ساتھ ابھرے۔ ہم خدا سے اپنی وفاداری اور طاعت و عبودیت اور

اتباعِ رسالت کا بار بار پیمان اگر الفاظ میں باندھتے ہیں تو اس لیے باندھتے ہیں کہ اس پیمان کی حقیقت ہمارے قلوب کو منور کرتی جائے۔

یہ ہے وہ حقیقت جسے نہ جاننے کی وجہ سے کچھ حضرات خود راستہ گم کر چکے ہیں اور دوسروں کی رہنمائی کر کے انہیں بھی ساتھ لے ڈوبنا چاہتے ہیں۔

اب لیجیے درود کی حقیقت! انسانی فطرت میں محسن کے لیے جذبۂ اعتراف پایا جاتا ہے اور یہ جذبہ ہمیشہ تحریک کرتا ہے کہ احسان کا جواب بقدرِ استطاعت احسان ہی سے دیا جائے۔ ایک بھولے بھٹکے شخص کو جب کوئی راستہ دکھا دیتا ہے تو اس میں جذبۂ تشکر و سپاس ابھرتا ہے۔ اسی طرح خدا کے جس رسولؐ نے ایک مسلمان کو اس کے خدا سے ملا دیا ہو، اسے دنیا کی صداقتِ عظمیٰ کا علم دیا ہو، اسے زندگی بسر کرنے کی سیدھی راہ دکھا دی ہو، اسے اونچی اخلاقی قدروں سے بہرہ ور کیا ہو، اسے حلال و حرام کی تمیز سکھائی ہو، کیا اس احسانِ عظیم کے جواب میں آدمی میں اعتراف، سپاس اور تشکر کا کوئی جذبہ نہ ابھرنا چاہیے؟ لازماً ابھرنا چاہیے، اور نہ ابھرے تو گویا ایک بدبخت آدمی کی انسانی فطرت قطعی طور پر مسخ شدہ ہے۔ اس فطری جذبہ کے ظہور کے لیے شریعت نے جو راستے بنائے ہیں وہ یہ ہیں:۔

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اور بے چون و چرا اطاعت اور آپ کے مشن کی زیادہ سے زیادہ خدمت۔

— آپ سے گہری محبت اور وابستگی اور آپ کا غیر معمولی احترام۔

— آپ کے احسان کا جواب احسان سے دینے کے لیے اپنی بیچارگی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے اس سے یہ دعا کرنا کہ اے اللہ تو ہی اپنے خزانۂ رحمت سے آنحضورؐ کے احسان کا جواب دے۔

یہی تیسری چیز ہے جس کو "درود" کہتے ہیں۔

آخر "درود" کے اس تصور میں کونسی نامعقولیت ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جائے یا اسے ملائی ڈھکوسلا کہہ کر شور مچایا جائے۔ یہ صریحاً ایک فطری ضرورت ہے۔ اس فطری ضرورت کا راستہ بند کرنے سے پہلے انسانی نفسیات میں اصلاح کرنی پڑے گی۔

عربی زبان میں اصل لفظ صلوٰۃ کا استعمال ہوا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی اسی طرح متعدد ہیں جس طرح دنیا کی ہر زبان کے بے شمار مصادر کے ہوتے ہیں۔ لیکن وہی معنی لیے جاتے ہیں جو موقع استعمال کے لحاظ سے عربی جاننے والوں کے ذہن میں پہنچتے ہیں۔ پھر اس میں بھی کوئی بات انوکھی نہیں ہے کہ صلوٰۃ جب بندے کی طرف سے ہو تو اس کے اور معنی ہوں اور جب خدا کی طرف سے ہو تو اس کے دوسرے معنی لیے جائیں۔ اگر "تاب الی اللہ" کے معنی "رجع عن معصیتہ الیہ" ہونے کے ساتھ ساتھ اگر "تاب اللہ علیہ" کے معنی "غفر لہ و رجع علیہ بفضلہ" ہو سکتے ہیں تو کیا پیچیدگی ہے اگر صلوٰۃ کے بندے کی طرف سے ہونے کے معنی دعائے رحمت کرنے کے ہوں اور صلوٰۃ کے اللہ کی طرف سے ہونے کے معنی اللہ کے رحمت فرمانے کے ہوں؟

ملاحظہ ہو البقرہ آیت ۱۵۷، "الذین اذا اصابتھم . . . اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ" میں صلوٰۃ اور رحمت متقارب المعنی الفاظ کو حرف عطف سے جوڑا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ آیت ۱۶۱ "الذین کفروا وماتوا . . . اولئک علیھم لعنۃ اللہ . . . اجمعین" میں مقابل کے ایک گروہ کے لیے "لعنت" کا بیان آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دونوں طرف دو متغائر پوزیشن کے گروہ ہیں۔ ایک کے لیے ان کے رب کی طرف سے صلوٰۃ و رحمت ہے اور دوسرے کے لیے لعنت۔ کیا یہ موقع واضح نہیں کر دیتا کہ اللہ کی طرف سے صلوٰۃ ہو تو اس کا مفہوم رحمت نازل کرنا اور عنایت فرمانا ہوتا ہے۔ رہے ملائکہ اور انسان تو ان کے پاس تو خزائن رحمت ہیں نہیں کہ وہ رحمت بھیجیں اور عنایت فرمائیں، وہ تو بہر حال رحمت کے خزانوں کے مالک ہی کے سامنے درخواست پیش کر سکتے ہیں۔ صلوٰۃ کا لفظ دعا کے معنی میں کثیر الاستعمال ہے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں۔

اب ایک چیز اور قابل حل رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک گروہ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ لفظ صلوٰۃ کے معنی ہی غلط بنا دیے گئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ لغت دیکھیے، شروع سے آج تک جو تفاسیر قرآن کی لکھی گئی ہیں ان پر نگاہ ڈالیے، پورے دینی لٹریچر کو کھنگالیے، احادیث کے دفتر چھانٹیے اور ان ساری شہادتوں سے معلوم کیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ یا درود بھیجنے کے معنی اللہ تعالیٰ اور بندوں کی طرف سے کیا قرار پاتے

ہیں؟ اب یہ گروہ لغت، تفسیر، حدیث، معمولِ امت اور علماء دین کے سارے کے سارے لٹریچر کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ تو اصل دین کے خلاف ایک سازش تھی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اتنی بڑی سازش جب بھی شروع کی گئی ہوگی تو آخر اس پر کوئی نہ کوئی احتجاج علماء کے کسی نہ کسی گروہ نے کیا ہوگا؟ کوئی سرپٹول ہوئی ہوگی کہیں اختلافی بحثیں چھڑی ہونگی، تو پھر اس کے آثار کہیں نہ کہیں سے آپ کو ڈھونڈھ کے لانے چاہئیں۔ یہی مظلوم درود "اللھم صل علی محمد" تو خود نماز میں شامل ہے اور نماز سوسائٹی کے عملی تواتر سے ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ اگر یہ بھی مشتبہ ہو گئی تو عملی تواتر بھی سند نہ رہا اور عملی تواتر سند نہ رہا تو قرآن کی صحت کو کس دلیل سے ثابت فرمائیے گا! آپ کو ریسرچ کر کے یہ واضح کرنا چاہیے کہ کب تک نماز اس درود سے خالی اور اپنی اصلی حالت پہ قائم رہی، پھر کس وقت کونسے لوگ تھے جنہوں نے یہ پیوند اس میں لگایا؟ اس واقعہ پر امت میں کیا ردِ عمل ہوا؟

یا پھر کیا آپ اس سازش میں نعوذ باللہ خود صحابہ کرام کو بھی شریک کرتے ہیں؟ — ہاں شاید یہ بات کہنے کی جرأت نہ ہو لیکن ذہن میں موجود معلوم ہوتی ہے۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں: اگر صحابۂ کرام ہی کو اصل دین کا پتہ نہ چلا، یا پتہ چلا تو سہی، لیکن (نعوذ باللہ) اس میں تحریف کر ڈالی تو پھر تو سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ "اب کسے رہنما کرے کوئی!" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی درکنار رکھ دیا، اس کے بعد صحابہ کرام، خلفائے راشدین، تابعین، تبع تابعین، ائمہ، فقہا، علماء سب کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا، احادیث، دینی لٹریچر اور تاریخی ریکارڈ کو سازش بنا ڈالا، تواترِ امت کو مشکوک ٹھہرا دیا، تو اب مسلمان کدھر جائے!

ان باتوں پر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ آپ خود محسوس کریں گے کہ یہ ہمارے دور کا ایک بڑا فتنہ ہے کہ دین کی مسلمہ اور نہایت معقول اور واضح حقیقتوں کے بارے میں عام لوگوں کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر کے پھر کہا جاتا ہے کہ اصلی اور خالص دین تو صرف ہم سے مل سکتا ہے، ہم قرآن کا کھرا اور خالص دین پیش کرتے ہیں!

اجماعِ امت

سوال :- اسلامی ریاست میں قانون سازی کی ایک صورت اجماع بھی ہے مگر اس میں ہر شخص رائے دینے کا مجاز نہیں - اس فیصلہ میں ائمہ اور مجتہدین ہی شریک ہوتے ہیں - اگر یہ صحیح ہے تو ائمہ کے باہمی کسی ایک مسئلہ پر اتفاق کر لینے کو اجماع امت کیونکر کہا جا سکتا ہے اور کیا یہ طرز جمہوری ہے ؟

جواب :- اس مسئلہ کو سمجھنے میں جو الجھن دراصل آپ کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہنی پس منظر میں تو غیر اسلامی نظام حیات اور اس میں علماء دین کی کمزور حیثیت ہے اور غور آپ اسلامی نظام پر کرتے ہیں - سوچ بچار کا یہ انداز ہر لحاظ سے غلط اور غیر منطقی ہے -

دنیا کی ہر ریاست اپنا ایک نصب العین رکھتی ہے اور اُس کی ساری قوتیں صرف اُسی کو حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہیں - اس عمل کا اثر حکومت کے سارے شعبوں پر پڑتا ہے اور اُن میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے - اب آپ غور کریں کہ جب ایک حکومت اپنے آپ کو اسلامی نظام حیات کے مطابق ڈھالتی ہے تو کیا اس کا پورا ڈھانچہ اس کے مطابق تبدیل نہیں ہوتا - ظاہر بات ہے کہ ایسی حکومت میں وہی لوگ آگے آئیں گے جو کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھتے ہوں - یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ حکومت اسلامی ہو، اور اس میں اہل الرائے وہ لوگ ہوں جو اسلام کی تعلیم سے بالکل کورے ہوں - جس طرح ایک سرمایہ دارانہ جمہوری نظام میں ارباب حل و عقد وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس نظام پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے رمز شناس بھی ہوں - اسی طرح اسلامی حکومت میں وہی افراد نمایاں ہونگے جو دین سے زیادہ سے زیادہ وابستگی رکھنے کے علاوہ اس کو زیادہ سے زیادہ سمجھتے بھی ہوں - انتخاب کا جو منصفانہ طریق بھی اختیار کیا جائے گا مسلم سوسائٹی کا یہی مکھن اوپر آئے گا، اور یہی دراصل مسلم قوم کے دل کی دھڑکنوں کی صحیح طور پر ترجمانی کرے گا - اس کا ایک مسئلہ پر متفق ہو جانا پوری امت کے متفق ہونے کا مترادف ہو گا - دنیا میں آج تک کبھی ایسا

نہیں ہوا کہ کسی مسئلہ کے حل کرنے کے لیے ہر ہر فرد کو بلا لیا جائے، یا اس کی رائے لی جائے۔ قوم کے نمائندے ہی باہم سر جوڑ کر کسی ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے ہیں اور بالآخر یہی قوم کا متفقہ فیصلہ قرار پاتا ہے۔

قومی ملکیت

سوال:۔ "اگر ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا کر اُسے نیک اور صالح افراد کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو کیا اس سے وہ سارے مفاسد دُور نہ ہونگے جو سرمایہ داری اور کمیونزم میں پائے جاتے ہیں۔؟"

جواب۔ آپ کا یہ سوال اُس طرزِ خیال کی ترجمانی کرتا ہے جو ہمارے ملک میں کچھ عرصہ سے قوت پکڑ رہا ہے۔ کچھ لوگ نہایت سادگی سے اس کے طلسم میں گرفتار بھی ہو رہے ہیں۔ آپ ذرا ان کی منطق کو دیکھیے۔

- سرمایہ کو افراد کے ہاتھوں سے نکال کر قوم کی ملکیت میں دے دینا چاہیے۔
- کیوں؟
- کیونکہ اس سے جو قوت افراد کو حاصل ہوتی ہے وہ انہیں ظالم جابر اور مستبد بنا دیتی ہے اور وہ کمزوروں کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناتے ہیں۔

اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی کہ پورے ملک کے سرمایہ اور ذرائع پیداوار کو چند لوگوں کے ہاتھوں میں دے جائے۔ کیا ان کی اپنی منطق کے مطابق یہ بے پناہ قوت انہیں زیادہ ظالم اور مستبد نہ بنائے گی۔ اس معاملہ میں اس طرزِ فکر کے لوگوں کی منطق بڑی نرالی اور دلچسپ ہے۔

آپ کے اس ارشاد کے متعلق کہ "کیا اس سے وہ سارے مفاسد دُور نہ ہونگے جو سرمایہ داری اور کمیونزم میں پائے جاتے ہیں" عرض ہے کہ خیر اور بھلائی تو اسلام کو اپنانے میں ہی ہے اور مفاسد کو

دُور کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہوگا وہ سلامتی سے ہٹا ہوا ہوگا۔ اسلام جس طرح یکسر آزاد معیشت کے خلاف ہے اسی طرح ذرائع پیداوار کو بھی قومی ملکیت بنا دینے کا مخالف ہے۔ آپ اگر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادیٔ ضمیر، عزتِ نفس، خود اعتمادی ایسی صفات اسی صورت میں پرورش پاتی ہیں جب انسان کو اس امر کا احساس ہو کہ وہ روٹی حاصل کرنے کے لیے غلامی اختیار کرنے پر مجبور نہیں، اور اگر وہ چاہے تو خدا کی وسیع و عریض کائنات میں اپنے وسائل رزق آزادی کے ساتھ ڈھونڈھ سکتا ہے۔ کیا آپ پوری دنیا کو ایک جیل خانہ بنانے میں ہی انسانیت کی فلاح دیکھتے ہیں؟ (ع-ح)

بقیہ اشارات

بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ یا مذہب کا قلادہ گلے سے نکال کر دنیا کے میدان میں پوری چھوٹ پا لیتا ہے۔

ان مذاہب کا یہ خلاء کہ یہ انسان کو دنیا میں اجتماعی زندگی کے سارے فرائض انجام دیتے ہوئے خدا سے نہیں ملا سکتے اور سیاسی و تمدنی مسائل میں کوئی مکمل رہنمائی بہم نہیں پہنچاتے، یہی اس کا موجب ہوا کہ تاریخی مواقع پیدا ہو جانے پر "مذہبی طبقات" آگے بڑھیں، اس خلاء کو پُر کریں اور خدا اور مذہب کے نام پر اپنی مرضی کو مقدس ضابطہ بنا کر عوام الناس پر ٹھونس دیں۔ اس لحاظ سے تھیوکریسی کا ظہور ہمیشہ کسی مذہبی نظام کے اس نقص کا نتیجہ تھا کہ وہ دنیوی معاملات کے لیے رہنمائی نہیں دیتا تھا اور اس نظام کے زیر اثر آنے والے انسانوں کے لیے مذہب کی منظوری کے بغیر دنیوی معاملات چلانا طمانیتِ ضمیر سے محرومی کا موجب تھا۔ چنانچہ مذہبی طبقوں اور عام لوگوں میں یہ سودا ہوا کہ ہم تم کو دنیوی معاملات میں مذہب کی منظوری بہم پہنچائیں گے تم ہمارا اقتدار مانو۔ اس سودے نے مذہب (جیسا کچھ بھی رہا ہو) کا الگ ستیاناس کر دیا اور نظامِ تمدن کا الگ حلیہ بگاڑ دیا! یہ تلخ تجربہ اس انجام کو پہنچا کہ مذہبی طبقوں کے تسلط کے خلاف عام آدمی کو جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ خون خرابوں کے بعد اس سمجھوتے پر ختم ہوئی کہ دنیا کے معاملات میں مذہب کا کوئی دخل